# سورہ بقرہ

## ایک مطالعہ

خرم مراد

ترجمہ

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی

# فہرست مضامین

# دیباچہ

دنیا میں قرآن جیسی کوئی کتاب نہیں۔ یہ کتاب انسانی قلوب کو تازگی بخشتی اور انکی زندگی میں انقلاب برپا کرتی ہے۔ یہ کتاب بنی نوع انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ایک ایک فرد کی اعلی اخلاقی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ کتاب انسان کے ذہن ودماغ میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو رفع کرتی اور زندگی کی جدوجہد میں اس کی بھرپور رہنمائی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ کتاب ان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہے۔ یہ کتاب مسلمانوں کو تہذیب وثقافت اور شہرت وناموری کے اعلی مدارج تک پہنچا سکتی ہے یا پھر انہیں ذلت ورسوائی میں ڈھکیل سکتی ہے، اب یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ اس کتاب کے ساتھ کس طرح کا تعلق استوار کرتے ہیں۔

قرآن مجید ایک انمول اور ناقابل بیان علم وحکمت کا خزانہ ہے۔ یہ اپنے خالق کے ساتھ مبارک گفتگو کی لامحدود مسرت وشادمانی سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ علم وحکمت کی ایک ایسی عظیم کتاب ہے جو اپنے آقا ومالک کے راستے پر چلنے کی رہنمائی کرتی ہے، یہ ایک ایسا نور تاباں ہے جو نہ صرف روح کی گہرائیوں کو منور کرتا بلکہ سماجی زندگی کو بھی جگمگاتا ہے اور ہماری تمام تر انفرادی اور سماجی بیماریوں اور کمزوریوں کا صحت بخش علاج کرتا ہے۔ یہ بالعموم رحم وکرم اور عفو ودرگزر کا معاملہ کرتا ہے جس سے آڑے وقتوں میں بڑا حوصلہ ملتا ہے اور اس کے سہارے ہم بخوشی زندگی کے بار گراں کو اٹھا سکتے اور دنیا وآخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی صورت میں علم وحکمت کا یہ خزانہ تمام طالبان حق کے لئے یکساں طور پر میسر ہے۔ چنانچہ جس طرح آج لوگ اس سے فیضیاب ہو رہے ہیں اسی طرح کل یعنی چودہ سو سال پہلے بھی لوگ فیضیاب ہو رہے تھے۔

قرآن مجید کا اپنے ماننے والوں سے ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ اسے سنو تو اچھی طرح سنو اور سمجھو تو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس پر خود بھی عمل کرو اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی دعوت دو۔ اور اس بات کی کوشش کرو کہ پوری دنیا کے انسانوں کی زندگی قرآن مجید کے دیئے ہوئے نقشہء حیات میں ڈھل جائے۔ ان تمام امور کو سرانجام دینے کے بعد ہی قرآن مجید ہمارے لئے اپنے علم وحکمت کے خزانے کا دہانہ کھولے گا اور تبھی ہمارے مقدر کا ستارہ چمکے گا۔

میں اللہ تعالی کے اس بے پایاں فضل واحسان سے گراں بار ہوں اور اس کے شکر سے زندگی بھر عہدہ برآنہیں ہوسکتا کہ وہ مجھے اپنے بے پناہ خزانہء علم میں سے کچھ نہ کچھ ہمیشہ نوازتا رہا ہے حالانکہ یہ نوازشیں میری اہلیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں البتہ قرآن مجید کے بحر بے کراں کے مقابلہ میں یہ ایک حقیر قطرہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے تمام مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں انہیں فرائض کے احساس کے نتیجے میں ہمیشہ سے میرا یہ معمول رہا ہے کہ میں نے قرآن مجید کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی سمجھا خواہ وہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو، اسے دوسروں تک پہونچانے کی کوشش کی۔

میرے اس کتابچہ کے لکھنے کا مقصد جیسا کہ اپنی کتاب ''قران کا راستہ'' (Way to the Quran) کے دیباچہ میں بھی ذکر کیا ہے، بہت معمولی اور سادہ ہے۔ یہ کوئی اعلی درجہ کا علمی اور تحقیقی کام نہیں بلکہ میں اسے ایک اوسط درجے کے کم پڑھے لکھے قرآن مجید کے عام شائقین بالخصوص مرد وخواتین کے لئے لکھ رہا ہوں جو اسے پڑھ کر اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ میں ایک دوسرے کو راہ دکھانے کی نیت سے وہی کچھ لکھ رہا ہوں جو میں نے خود اسے پڑھ کر سمجھا ہے۔ اس لئے ناظرین کو زیر مطالعہ کتاب میں نہ زبان وادب کا کوئی اعلی اسلوب ملے گا اور نہ فکر ونظر کا اعلی نمونہ، نہ منطق وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل سامنے آئیں گے اور نہ فقہی مسائل کی طویل بحثیں، بلکہ تمام ضروری باتیں نہایت سادہ اور عام فہم زبان واسلوب میں بیان کردی گئی ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے پیغام اور اس کی آیات کو ہر قاری کے دل ودماغ تک ٹھیک پہنچا دیا

جائے۔ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود، مجھے پوری امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے قاری کو ایک نئی تازگی ملے گی کیوں کہ مجھے قرآن مجید کے اس وعدہ پر پورا یقین ہے کہ ''ہم نے قرآن مجید کو یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لئے آسان کر دیا ہے''۔

ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں ہماری زندگی کا مرکز و محور قرآن مجید ہونا چاہیے، یہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ بغیر اس کے ہم مسلمان کبھی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکیں گے۔ ہمارا وجود بے معنی ہوگا اور ہم اس دنیا میں کبھی بھی عزت و توقیر سے سرفراز نہیں ہو سکیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بغیر ہم اپنے خالق و مالک اور پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامے بغیر تنزلی اور پستی تمام بنی نوع انسان کا مقدر بن کے رہ جائے گی۔

قرآن مجید کے نزدیک امت مسلمہ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اسے کس مقصد کے لئے برپا کیا گیا ہے؟ امت مسلمہ کی تشکیل کیسے عمل میں آئے گی اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرے گی؟ دل و دماغ کو منور کرنے، اخلاق و عادات کو آراستہ کرنے اور عبادت و ریاضت کا خوگر بنانے کے لئے کون سے ذرائع استعمال کئے جائیں، اس مقصد کے حصول کے لئے معاشرتی زندگی اور اس کے اداروں کو کس طرح منظم کیا جائے؟ ان تمام امور کو بڑی تفصیل کے ساتھ نہایت خوبصورت انداز میں سورہ بقرۃ میں سمو دیا گیا ہے۔ پوری سورہ کی تفسیر و تشریح گرچہ اہم ہے لیکن بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے ہم نے اختصار کے ساتھ پوری سورہ پر تبصرہ کیا ہے اس کے عمود اور بنیادی نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام بھی بجائے خود نہایت مفید اور کارآمد ہوگا۔ اس ایجاز و اختصار کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ یہ پڑھنے والے کے شوق کو مہمیز کرے گا اور اس کے نتیجے میں اس کے اندر ہل من مزید کی کیفیت پیدا ہوگی۔ جو اسے پوری سورہ کو بالتفصیل پڑھنے پر مجبور کرے گی۔ مختصراً یہ کہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتابچہ نہ صرف سورہ بقرہ کے سمجھنے میں کلیدی رول ادا کرے بلکہ پورے قرآن مجید کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو۔

آخر میں اللہ تعالی سے دعا گو ہوں کہ وہ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، میری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرے، جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر مجھے عمل کرنے کی توفیق بخشے، اور مجھے ایسے لوگوں سے دور رکھے جن کے قول و عمل کا کوئی اعتبار نہیں۔

خرم مراد

لیسٹر، ۲۷، ربیع الاول ۱۴۱۷ھ

۱۲، اگست ۱۹۹۶ء

سورہ بقرہ قرآن مجید کی دوسری اور طویل ترین سورہ ہے جو تقریباً ڈھائی پارہ پر محیط اور ۲۸۶ آیات پر مشتمل ہے۔ اسے قرآن مجید کے شروع میں سورہ فاتحہ کے معاً بعد رکھا گیا ہے۔ یوں یہ ترتیب میں دوسری سورہ ہے لیکن بعض دیگر پہلوؤں سے اسے پہلی سورہ ہونے کا شرف حاصل ہے، مثلاً اگر ہم سورہ فاتحہ کو دیباچۂ قرآن تصور کریں تو پھر سورہ بقرہ قرآن مجید کی پہلی سورہ قرار پائے گی۔ اسی طرح اگر سورہ فاتحہ کو خدا کے سامنے بندے کے دل سے نکلی ہوئی یہ صدا قرار دیں جس میں وہ فوری طور پر اپنے رب سے اس دنیا میں صراط مستقیم پر چلانے اور اس پر قائم رہنے کی دعا کرتا ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے، تو سورہ بقرہ خدا کی طرف سے بندے کی دعا کا پہلا جواب، صراط مستقیم کا پہلا سبق اور صحیح رخ پر زندگی گزارنے کا پہلا زینہ ہے، یا یوں کہیں کہ سات آیات پر مشتمل سورہ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن مجید کے بیج، بنیاد، اور خلاصہ کی ہے، اور جیسا کہ فی الواقع ہے بھی، تو سورہ بقرہ اس چھوٹے سے بیج کی پہلی کونپل ہے اور پھر یہ کونپل نشو ونما پا کر ایک تناور درخت بن جاتی ہے جس کی جڑیں تحت الثریٰ میں پیوست اور شاخیں آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔

''اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔'' (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

گرچہ ترتیب میں سورہ بقرہ کو قرآن مجید کے بالکل شروع میں رکھا گیا ہے تاہم اس کی آیات کا نزول مدنی زندگی کے مختلف اوقات میں بہت بعد میں ہوا ہے۔ واحدی کے مطابق آیت ۲۸۱ کا نزول رسول اللہ ﷺ کے حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا ہے۔

## سورہ بقرہ کا مقام

سورہ بقرہ کو قرآن مجید کے شروع میں کب اور کیوں رکھا گیا خصوصا ایسی صورت میں جب کہ اس کے مضامین کا تعلق امت مسلمہ کی سماجی زندگی سے ہے نہ کہ اس کے بنیادی عقائد سے کہ جس کی حیثیت اساسی ہے اور جس کو بہر صورت اولیت حاصل ہے اور ابتدائی وحی کا بیشتر حصہ انہی آیات پر مشتمل ہے۔

آیئے پہلے اسی سوال پر غور کرتے ہیں۔ یقیناً اس کے کچھ دلائل ہوں گے اور اس کے جو جوابات دئے گئے ہیں وہ سورہ کے معنی و مفہوم کو سمجھنے میں نہایت اہم رہنما خطوط فراہم کریں گے کیوں کہ قرآن مجید میں کوئی چیز بے مقصد نہیں ہے۔ اس اصول سے یقیناً ہم قرآن مجید کے سمجھنے اور اس میں بیان کئے گئے حقائق کا ادراک کرنے کا ایک طریقہ دریافت کر سکتے ہیں۔ گرچہ ہر کیوں کا جواب تو نہیں دیا جا سکتا پھر بھی غور و فکر کے لئے ہر نقطہ پر سوال اٹھانا ضروری ہے۔

قرآن مجید پر غور و فکر کرتے وقت دو چیزیں ضرور ذہن میں رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ غور و فکر کے نتیجہ میں جو رائے بھی قائم کیجائے اس کے تئیں بہر حال یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ محض ایک انسانی فہم کا نتیجہ ہے جس میں ہر ممکن غلطی کا امکان موجود ہے۔ اسے الہامی علم کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی ایسی رائے جو امت مسلمہ کے عملی تواتر سے متصادم یا بحیثیت مجموعی قرآن مجید کی روح کے منافی ہو تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔ یہ دو تنبیہات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے اس کے بعد قرآن مجید میں غور و فکر کرتے وقت خواہ کتنے ہی سوالات ذہن میں آئیں کوئی مضائقہ نہیں۔

سورہ بقرہ سے متعلق مذکورہ بالا سوال بجائے خود ایک بہت بڑے سوال کا موجب ہے۔ یعنی قرآن مجید کو تاریخی طور پر نزولی ترتیب میں کیوں نہیں مدون کیا گیا۔ موجودہ تدوین تاریخی ترتیب کے ساتھ کیوں نہیں ہے اور اس تدوین کی حیثیت کیا ہے؟

کچھ محققین کا خیال ہے کہ صحابہ کرام نے اسے اپنے ذاتی فیصلے کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے اور انہیں اس میکانکی ترتیب کے علاوہ اور کوئی بہتر صورت نظر نہیں آئی کہ اسے کمیت کے اعتبار سے ترتیب دے دیا جائے۔ چنانچہ حجم میں جو سب سے بڑی سورہ نظر آئی اسے بالترتیب مقدم کردیا اور جو سب سے چھوٹی تھی اسے اسی لحاظ سے موخر کردیا۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں ترتیب دیا ہے۔ اس لئے سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور یہی ترتیب مستند ہے۔ میرے خیال میں شواہد دوسری رائے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ جب کسی نئی وحی کا نزول ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کاتبین وحی سے کہتے کہ اسے فلاں آیت کے بعد لکھو۔ (سیوطی) دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ ہی میں تمام سورتیں بجائے تاریخی ترتیب کے موجودہ ترتیب ہی میں جمع کی جاچکی تھیں اور جس ترتیب میں آج موجود ہیں اسی ترتیب میں رسول اللہ ﷺ نمازوں میں پڑھتے پڑھاتے تھے اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ رمضان میں رسول اللہ ﷺ حضرت جبرئیلؑ کی موجودگی میں پورے قرآن مجید کا دور کرتے تھے۔ اور آخری بات یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کے آغاز اور خاتمہ میں بڑا گہرا ربط ہے جو تاریخی ترتیب میں ممکن نہیں تھا۔

میرے خیال میں بجائے تاریخی ترتیب کے موجودہ شکل میں قرآن مجید کی جمع وترتیب کے دو اہم اسباب ہیں:

ایک تو یہ کہ گرچہ قرآن مجید کا نزول ایک خاص جگہ، ایک خاص وقت، مخصوص حالات کے مطابق اور کچھ مخصوص لوگوں کو سامنے رکھ کر ہوا ہے تاہم قرآن مجید ایک خدائی پیغام ہے جو رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔ قرآن مجید نے، اپنی نزولی ترتیب سے مکمل گریز کرتے ہوئے، بہت سے مستشرقین کی خواہش کے علی الرغم، اپنے آپ کو زمانی مکانی حدود سے پرے، آفاقی اور دائمی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اس لئے اس کی

تعلیمات ہمیشہ ہمہ وقت اور ہر طرح کے حالات میں موزوں اور برمحل ہیں۔لیکن اگر اس کی جمع وترتیب نزولی اور تاریخی طور پر عمل میں آئی ہوتی تو یہ انہیں وقت وحالات اور علاقہ تک محدود ہوکر ایک تاریخی واقعہ بن کر رہ جاتا اور اس کی دائمی اور آفاقی حیثیت ختم ہوجاتی۔

گرچہ شان نزول کی اپنی ایک اہمیت ہے۔اس سے کسی آیت کے نزول کے تاریخی پس منظر کا پتہ چلتا ہے اور آیت کو اس پس منظر میں رکھ کر سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کی روشنی میں نہ صرف ایک عام حکم کا استنباط کرنے یا پھر اسے دوسرے سیاق میں لے جانے میں سہولت ہوتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید نے وقت اور حالات کے مطابق کس طرح رہنمائی کی ہے۔تاہم برصغیر کے ۱۸ویں صدی عیسوی کے ایک عظیم اور نامور محقق شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۲ء۔۱۷۶۳ء) نے شان نزول سے متعلق جو حقائق بیان کئے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔اصول تفسیر پر اپنی گرانقدر تصنیف میں انہوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کے کسی بھی حصہ سے متعلق وہی شان نزول معتبر ہوگا جس سے بنی نوع انسان کو صحیح عقائد وعمل کی رہنمائی ملتی ہو۔ان کے مطابق بہت سے ایسے شان نزول بیان کئے جاتے ہیں جن سے قرآن مجید کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی اور ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جن کی صداقت بھی مشکوک ہے۔(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر)

دوسرے یہ کہ خاص طور پر جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا، اس کے اولین مخاطب دو تھے۔ایک تو مشرکین مکہ جو قرآن ورسول کے منکر تھے، اور دوسرے مومنین جو امت مسلمہ کی مطلوبہ جماعت میں داخل ہو رہے تھے لیکن جب نزول قرآن کا سلسلہ مکمل ہوگیا اور مومنین کی جماعت تشکیل پا گئی اور اس وقت کے منکرین ومخالفین اسلام نے یا تو اسلام قبول کرلیا یا ختم ہوگئے، تو پھر مومنین ہی ہمیشہ کے لئے اس کے مخاطب قرار پائے۔کیوں کہ قرآن مجید امت مسلمہ کو بطور امانت دیا گیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی حفاظت

کرے، اس کو سمجھے اور وقت و حالات کے مطابق اس کی تشریح و تفسیر کرے، اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی دعوت دے، گوکہ نزول وحی کے وقت ایمان و عقائد سے متعلق بنیادی پیغام کو مقدم رکھنے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اسی طرح مخالفین اسلام کی سرگرمیوں کا ذکر اور اس کا دفاع اور پھر مسلمانوں کی اخلاقی صورت گری اور امت مسلمہ کی تشکیل جیسے عظیم الشان کام کو اولیت دی گئی ہے تاہم اس بنیادی کام کی تکمیل کے بعد امت مسلمہ کے مقاصد، ان کے سماجی مسائل اور ان کی ضروریات زندگی سے متعلق ضروری ہدایات وغیرہ کو مقدم کر دیا گیا ہے، امت مسلمہ کو جو قرآن مجید پر ایمان رکھتی ہے اور قرآن مجید ہی سے اخذ شدہ اصول کی روشنی میں اپنی شخصیت کی تعمیر کرتی ہے، رہتی دنیا تک کے لئے ہمیشہ یہ تقدم حاصل رہے گا۔ کیوں کہ اس نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا عزم کیا ہے۔

اس روشنی میں ہم سورہ بقرہ کے مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے لوح قرآن کی پیشانی پر رکھنے کا عقدہ کھل جاتا ہے اور اس سے ہمیں پوری سورہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیوں کہ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ بقرہ میں نہ صرف امت مسلمہ کے مشن کی تعیین کی گئی ہے بلکہ اس مشن کی تکمیل کے لئے تمام ممکنہ بنیادی ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

## سورہ بقرہ کے فضائل

سورہ بقرہ کی انہی خصوصیات کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کے بڑے فضائل بیان کئے ہیں۔ حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن مجید کی چوٹی سورہ بقرہ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں اس کی تلاوت دن میں کرے تو تین روز تک دن میں شیطان اسکے گھر میں نہیں داخل ہوگا اور اگر کوئی رات میں کرے تو تین روز تک رات میں نہیں داخل ہوگا۔ (ابن کثیر، طبرانی)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبر نہ بناؤ کیوں کہ شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں سورہ بقرہ کی تلاوت کی جا رہی ہو۔ (مسلم، ابن کثیر)

ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن مجید کی تلاوت کرو کیوں کہ وہ اپنے مصاحبوں کا شافع ہے۔ دو مہر تاباں یعنی سورہ بقرہ اور آل عمران کی تلاوت کیا کرو کیوں کہ حشر کے دن یہ دونوں ''دو سحاب'' یا دو ''شامیانہ'' بن کر یا چڑیوں کے غول کی صورت میں آئیں گی اور اپنے تلاوت کرنے والوں کی طرف سے وکالت کریں گی۔ سورہ بقرہ کی تلاوت کرو کیوں کہ اس کا یاد کرنا رحمت اور نظر انداز کرنا بڑی ندامت کا باعث ہے اور محض کاہل ہی اس کی تلاوت کا اہتمام نہیں کرتا۔ (مسلم، ابن کثیر)

ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی سورہ بقرہ کی تلاوت کرے اس پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت سایہ فگن ہوگی۔ وہ شخص بڑی عظمت کا حامل ہوگا جس نے سورہ بقرہ پر بصیرت حاصل کر لی ہو۔ مسلمانوں کو سورہ بقرہ یاد کرنے کی تاکید کرو۔ (قرطبی)

سورہ بقرہ مضامین کا بحر ذخار ہے۔ اس میں جو جتنی ہی غواصی کرے گا اتنا ہی رشد و ہدایت اور علوم و معارف کے انمول خزانے سے بہرہ مند ہوگا۔ انہی علوم و معارف کے بحر بے کراں کے تناظر میں عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک بار کہا تھا کہ مجھے سورہ بقرہ کے یاد کرنے میں آٹھ سال لگ گئے۔ (سیوطی)

## سورہ بقرہ کا عمود (بنیادی مضمون)

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سورہ ایک وحدت ہے اور اپنے معنی و مفہوم کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو بظاہر اپنے مضامین سے غیر مربوط نظر آتا ہے تاہم وہ

نہایت مربوط اور ایک مستحکم نظام سے منسلک ہے۔ ہر سورہ کا ایک عمود ہوتا ہے، جس کے گرد سورہ کے تمام مضامین گھومتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سورہ بقرہ کا عمود کیا ہے۔ میرے نزدیک سورہ بقرہ کا عمود، امت مسلمہ کا مشن ہے۔ یعنی امت مسلمہ کے مقاصد کی تعیین کرنا، اس کے حصول کی تلقین کرنا، اس کو جامہ عمل پہنانا اور اس کی تکمیل کے لئے امت مسلمہ کو بہر صورت تیار کرنا اور اس بات کی نگہداشت کرنا کہ اس مشن میں کسی بھی قسم کا انحراف یا اس سے کنارہ کشی کا رجحان پیدا نہ ہو۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ سے اس عمود (Theme) پر روشنی پڑتی ہے۔

''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز کی گواہی؟ تو یہ گواہی حق وصداقت اور رشد وہدایت کی گواہی ہوگی یعنی یہ گواہی دینا کہ خدا ایک ہے، قرآن مجید الہامی کتاب ہے، پیغمبر آخر الزماں سچے پیغمبر ہیں، خدا کا پیغام انہی کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے اور آخرت شدنی ہے جس میں ہمیں اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا حساب دینا ہے۔

چونکہ امت مسلمہ ایمان کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اس لئے اس کی حیثیت دینی اور مذہبی جماعت کی ہے۔ ایمان کے معنی ہیں کہ اسے قبول کرنیوالا شخص ذاتی طور پر فعال، متحرک اور خدائی احکام وہدایات کا مکمل طور پر پابند ہو۔ یہ ایمان تقاضا کرتا ہے کہ اسے قبول کرنے والا شخص اقوال واعمال اور حرکات وسکنات میں کلیتاً خدا کے سامنے سرفگندہ ہو۔ (بقرہ:۲۰۸) اور وہ خدا کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ایمان امت مسلمہ کی پہچان ہے۔ ایمان انفرادی اور اجتماعی امن واستحکام کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ حق کا گواہ بن کر کھڑے ہونا، یا حق کا علمبردار بننا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہ ایمان کا نہایت اہم اور بنیادی تقاضا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایمان کی دعوت کا یہی

مرکزی نکتہ پوری سورہ پر محیط ہے۔

اس سورہ میں جو خطاب کا اسلوب اپنایا گیا ہے وہ عمومی اور اجتماعی ہے، مثلاً ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو'' وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ پورے قرآن مجید میں کہیں بھی تنہا کسی فرد کو خطاب نہیں کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعیت کا فروغ ایمان کی فطرت میں ہے۔ اس لئے اس میں خطاب امت سے ہوگا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ سورہ بقرہ آیت (۴۰۔۱۲۳) میں خطاب بنی اسرائیل سے کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مومنین کی نئی مذہبی جماعت کے سامنے سابقہ مذہبی جماعت بنی اسرائیل کی پوری تصویر سامنے آجائے جس سے انہیں یہ سمجھنے میں مدد ملے کہ کس راہ پر چل کر وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے اور ان کے دل ودماغ اور اخلاق وکردار کے امراض کیا تھے جس نے انہیں اس کگار پر لا کھڑا کیا کہ انکے مستحکم سماج اور ٹھوس عقائد کی بنیادیں ہی ڈھ گئیں۔

## سورہ بقرہ کی ساخت

کوئی بھی شخص سورہ بقرہ کو پڑھ کر مضامین کے اعتبار سے اسے چند متعین ابواب میں تقسیم کرسکتا ہے۔ گو کہ ان میں سے ہر باب کا اپنا الگ ایک موضوع ہے تاہم وہ باہم دیگر مربوط ہیں۔ پھر ان میں سے ہر باب کو بغرض سہولت ذیلی ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس رو سے یہ سورہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

## باب اول: بنیادی ربانی ہدایت (آیت ۱۔۳۹)

۱۔۱۹ تک کی آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ ربانی ہدایات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔

سورہ کا آغاز اس اہم حقیقت کے اعلان سے ہوا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، اصلی

ہے اور اس کی حقانیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ''یہ خدا کی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں'' اس طرح کا دعویٰ پورے قرآن مجید میں سورتوں کے آغاز اور درمیان میں جگہ جگہ ملے گا۔ یوں قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا ہر شخص نہایت ادب واحترام کے ساتھ سمجھنے اور اطاعت کرنے کے جذبے سے سرشار ہوکر اس کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ کتاب کس مقصد کے لئے نازل ہوئی؟ ہدایت ورہنمائی کے لئے۔ کس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے؟ متقیوں کی، یعنی وہ جو طبع سلیم رکھتے ہیں جن کے اندر خدا کا خوف ہوتا ہے اور صحیح خطوط پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یا پھر وہ لوگ جو اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متقیوں کی چند خصوصیات کو آیت ۲۔۵ میں بیان کیا گیا ہے جس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا ذہن میں رہنا چاہیے کہ ان خصوصیات کی حیثیت بنیاد کی ہے اور اسی کی اساس پر قرآن مجید متقیوں کی مزید تفصیل بیان کریگا۔ یہ کہنا کہ یہ صرف متقیوں کے لئے ہدایت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض ایسے ہی لوگ جو تقویٰ کی صفت سے متصف ہیں اور اسکی جملہ خصوصیات کے حامل ہیں وہی قرآن مجید کی ہدایات سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔ اگر اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہدایت کے لئے تقویٰ شرط اولیں ہے تو دیگر خصوصیات کا قرآنی مفہوم کے بجائے لغوی مفہوم لینا پڑے گا ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب سے ہدایت ایک ہدایت یافتہ شخص ہی کو مل سکتی ہے۔ تاہم کسی حد تک یہ مفہوم بھی درست ہوگا۔ ورنہ تقویٰ کی ترقی کا مفہوم بے معنی ہوکر رہ جائے گا جب کہ تقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں اور ایک شخص تقویٰ کی بنیاد پر اس کے اعلیٰ مدارج تک پہونچ سکتا ہے۔ یوں ہر شخص کو تقویٰ کے کسی نہ کسی درجہ پر فائز ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ (محمد: ۱۷)

بلکہ اس سے زیادہ ہم آہنگ مفہوم یہ ہے کہ قرآنی ہدایات، افراد و معاشرہ کے اندر تقویٰ کی صفات پیدا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ ایم اے کا نصاب ہے۔ اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں لیا جاتا کہ اس نصاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے پہلے ہی سے ایک شخص کا ایم اے ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد ایک شخص ایم اے کی ڈگری پا سکتا ہے۔ اسی طرح بالکل ابتدائی پانچ آیتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کیسے قرآن مجید افراد و معاشرہ کو متقی بناتا ہے۔ صراط مستقیم بھی تقویٰ کی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کی زندگی اور دنیا و آخرت میں اس کے ثمرات قرآن مجید کا مستقل عمود ہے۔ شرط اولیں کی حیثیت سے لغوی مفہوم میں تقویٰ ایک ایسا فطری کلیہ ہے جو غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز کا کام کرتا ہے ایک ایسے داخلی استحکام کا نام ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل تسلیم کرنے میں معاون و مددگار رہتا ہے اور ایک ایسے وجدان کا نام ہے جو ہر مومن کے، کسی بھی قسم کے غلط کام کرنے میں سد راہ ہوتا ہے۔

اب سورہ ان لوگوں کی نشاندہی کرتی ہے جو الٰہی ہدایات سے کبھی بہرہ ور نہیں ہوں گے۔ سب سے پہلے وہ لوگ جن کے اپنے خیال میں قرآن مجید خدا کا کلام نہیں ہے۔ نتیجہ میں انکے قلوب پر مہر لگادی گئی۔ (آیت ۶۔۷) اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو زبانی تو خدا پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایمان نہیں لائے، (آیت ۸۔۲۰) انکی مختلف قسمیں ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کا نور بصیرت ختم ہوگیا ہے۔ یہ سخت ظالم لوگ ہیں اور فتنہ وفساد پھیلانا ان کا وتیرہ بن گیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے کو ہدایت سے محروم کرلیا ہے۔ یہ منافقین کا گروہ ہے جن کو قرآن مجید اندھا، بہرا اور گونگا قرار دیتا ہے اور ان پر انہیں کوئی پشیمانی بھی نہیں ہے۔ (آیت ۱۸) دوسری طرف ایسے کمزور ایمان والے بھی ہیں جو ایمان کا دعوی تو کرتے ہیں لیکن جب وہ ان سے ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتا ہے تو ہاتھ جھاڑ

کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہنے کا اپنے اندر حوصلہ نہیں پاتے۔ یہ اپنے ایمان وعقیدہ کے اعتبار سے منافق ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ آسمان میں جب بجلی چمکتی ہے تو یہ اس کی روشنی میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (آیت ۲۰)

یہاں سے اب خطاب تبدیل ہوتا ہے اور سورہ تمام انسانوں کو مخاطب کر کے قرآن مجید کا یہ اصلی اور بنیادی پیغام قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نہ ہی اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اپنا مالک و پروردگار بناؤ۔ (۲۱۔۲۲) اسی کے حوالہ سے یہ سورہ قرآن مجید کی حقانیت اور رسول اللہ کی رسالت ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے (۲۳۔۲۵) اور پھر انہی دونوں کی بنیادوں پر وہ زندگی کی مقصدیت کو ثابت کرتی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی کی تصدیق کرتی ہے۔ (۲۸۔۲۹) اسی کے ساتھ اس سورہ میں ان لوگوں کے ذہن ودماغ کے مفاسد اور اخلاق وکردار کے امراض کو اجاگر کر دیا گیا ہے جو قرآن مجید کے سننے کے باوجود گم کردہ راہ ہیں۔ (۲۶۔۲۷) یہ لوگ قرآن مجید کے مباحث اور اس کے بیان کردہ قصوں پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات قائم کر کے شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہیں۔

اس طرح آیت ۲۱۔۲۹ تک میں قرآن مجید کے تمام مضامین کا ایک مختصر خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ آیت ۳۰۔۳۹ میں تخلیق انسانی سے بحث کی گئی ہے اور اس بابت قرآنی نقطہ نظر کی وضاحت اور انسانی فطرت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ انسان کو علم و اختیار سے نوازا گیا ہے۔ یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہے اس لئے اسے لازماً اپنی ان حدود میں رہ کر زندگی گزارنی چاہیے جو اللہ تعالی نے اس کے لئے مقرر کر دئے ہیں۔ بایں طور اسے مستقل اچھائی اور برائی کے انتخاب میں کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا

ہے کیوں کہ یہ آزاد ہے اور محض اخلاقی طور پر جواب دہ ہے اس لئے وہ اس کشمکش میں گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ اب خیر وشر کی اس کشمکش میں جس نے عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا اور اپنی قوت ارادی سے شر پر غلبہ حاصل کرلیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دہرے انعام کا مستحق ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ گناہ گار کی توبہ قبول کرے گا اور اس کی گناہوں کو معاف کردے گا جیسا کہ اس نے حضرت آدمؑ کو معاف کیا (۳۷) دوسرے یہ کہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ الہامی اور ربانی ہدایات سے نوازے گا جیسا کہ اس نے حضرت آدمؑ سے وعدہ کیا ہے۔

## باب دوم: بنی اسرائیل، ایک مسلم امہ زوال کے گرداب میں:

### معاہدہ شکنی، امراض قلب اور نامعقول طرز عمل (آیات: ۴۰۔۱۲۳)

کون لوگ قرآن مجید سے فیض یاب ہوں گے اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے ان کے ذکر کے فوراً بعد (۱۔۲۰) تمام انسانوں کو محض اس خدا کی پرستش کی دعوت دی گئی جو بشمول انسان پوری کائنات کا تنہا خالق و مالک ہے۔ واقعۂ تخلیق کے ذکر، انسانی فطرت کی بابت قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت اور ربانی ہدایت و مغفرت پر انسان کے مکمل انحصار کا تذکرہ کرتے ہوئے (آیات: ۳۰۔۳۹) سورہ بقرہ کا خطاب بنی اسرائیل یعنی اس وقت کے یہود کی طرف مڑ گیا ہے اور ان سے یہ خطاب ۸۴ آیات یعنی ایک تہائی سورہ پر مشتمل ہے۔ یہ آیات انہیں یاد دلاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کتنے فضل و انعام سے نوازا تھا لیکن اس کے جواب میں وہ کتنی بد اعمالیوں اور عہد شکنیوں کے مرتکب ہوئے۔ یہ انکے قلوب کے امراض، ان کے اخلاق و کردار کے مفاسد اور ان کے ایمان وعمل کے معائب کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان آیات میں خدا سے کی گئی ان کی تمام بدعہدیوں کا ایک ایک کر کے ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس پر ان کو ملامت کی گئی ہے۔

قرآن مجید ایسا کیوں کرتا ہے؟ کیوں وہ شروع ہی میں بنی اسرائیل کی بابت اتنی تفصیل سے بحث کرتا ہے؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی ضرورت ہے۔ آیئے اب اس پہلو سے غور کریں۔

کیا قرآن مجید نے ایسا طریقہ اس لئے اپنایا کیوں کہ مدینہ میں خاصے یہود آباد تھے؟ بلاشبہ مدینہ میں یہود آباد تھے اور انہیں بھی دعوت اسلام دی گئی تھی۔ قرآن مجید ان کا ذکر اسی تناظر میں کرتا ہے جس میں وہ تھے اور جس طرح کا رویہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے پیغام کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسی لئے یہ ان کے ذکر کا ایک موقع اور سبب ہوسکتا ہے۔ تاہم تنہا یہ سبب یہود کے مالہ وماعلیہ کے اتنے تفصیلی ذکر کا متقاضی نہیں تھا۔

کیا ایسا اس وجہ سے تھا کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ کو رسول تسلیم کرنے میں جو سخت رویہ اختیار کیا یا انہوں نے جس حریفانہ اور معاندانہ رویہ کا مظاہرہ کیا اس پر آپ کو اظہار ناراضگی مقصود تھی جیسا کہ بہت سے مستشرقین کا خیال ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دستاویزی اور تاریخی شواہد بھی اس کی تائید وحمایت نہیں کرتے، کیوں کہ قرآن مجید کوئی ایسی کتاب نہیں کہ جس کا مقصد محض اپنے مخالفین پر غم وغصہ کا اظہار ہو اور وہ اس کا نہایت اہتمام سے آغاز کتاب ہی میں ذکر کر کے قارئین کے سامنے پیش کرے اور ان سے کہے کہ وہ مستقل اس پر غور کرتے رہیں۔ اس طرح کی کوئی چیز ہمیں عہد نامہ قدیم وجدید میں بھی نہیں ملتی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے بہت سے معاہدات امن کئے ہیں اور مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ہمیشہ ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ برتاؤ کیا گیا ہے۔

اس لئے عہد نبوی میں یہود کی مذمت کرنا قرآن مجید کا بنیادی مقصد نظر نہیں آتا بلکہ یہ رہتی دنیا تک کے لئے مسلمانوں کو ایک ایسا آئینہ دکھانا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں اور اس سے ابھرنے والی تصویر کی روشنی میں اپنے مقام ومرتبہ کو سمجھ سکیں۔ قرآن مجید بنی اسرائیل کی معزولی کا فیصلہ بھی سناتا ہے کیوں کہ وہ اپنے مشن کو جاری رکھنے میں

ناکام رہے اور ان کے منصب پر ایک نئی امت 'امت مسلمہ' کو سرفراز کرتا ہے جس کی تشکیل رسول اللہ ﷺ کی قیادت و رہنمائی میں عمل میں آئی تھی تا کہ انسانوں کی رشد و ہدایت کا خدائی مشن جاری رہ سکے۔

یوں قرآن مجید تاریخ کا برائے تاریخ ذکر نہیں کرتا۔ گوکہ اس نے بہت سی اقوام کی تاریخ ناموں کی صراحت کے ساتھ بیان کی ہے تاہم یہ محض تاریخی شواہد کے طور پر ہوا ہے۔ اس کا اصل مقصد اقوام کا مطالعہ پیش کر کے یہ بتانا ہے کہ ان سے کہاں کہاں غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان غلطیوں کے اسباب کیا تھے؟ تا کہ اس سے دوسرے لوگ سبق لے سکیں۔

مسلمان ابھی ایک نئی امت کی حیثیت سے ابھر رہے تھے جن کو ربانی ہدایت کا ضامن اور تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام بالخصوص خاتم النبیین ﷺ کے اس مشن کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا جس کے ابھی تک یہود تھے۔ مسلمانوں کی ابھی تک کی تاریخ ایک کھلی کتاب تھی اور ان کے مستقبل کی تاریخ کا کوئی قوم نمونہ نہیں بن سکتی تھی۔ عاد و ثمود کے لوگ مسلمان نہیں تھے، البتہ بنی اسرائیل اور مسلمانوں میں یک گونہ مماثلت تھی کیوں کہ دونوں 'توحید' کے قائل تھے۔ مسلمانوں کی طرح بنی اسرائیل کو توحید کے مشن اور شہادت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور فی الواقع وہ اپنے وقت میں اس کے علمبردار تھے بھی اور اس حیثیت سے وہ مسلم امہ تھے، البتہ وہ اپنے اخلاقی زوال کے نتیجہ میں اس کردار پر قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کی تاریخ وثقافت اور اخلاق وکردار کا واقعاتی اور تجزیاتی مطالعہ، ابتدائی دور میں مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ تھا اور اسی آئینہ میں وہ اپنے لئے وہ سب کچھ دیکھ سکتے تھے جس سے انہیں دوچار ہونے کا امکان تھا۔ اس سے مقصود یہود پر تنقید کرنا نہیں بلکہ مسلمانوں کو آگاہ کرنا ہے کہ تم ان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرنا۔ یہ آئینہ بتاتا ہے کہ مسلمان کب کہاں کیوں اور کیسے غلطیاں کر کے گمراہی میں مبتلا ہوکر کس

انجام سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم دھیرے دھیرے بنی اسرائیل کی راہ پر گامزن ہو جاؤ گے۔ (مسلم)

گوکہ یہاں خطاب براہ راست بنی اسرائیل سے ہے تاہم مومن اور حامل قرآن ہونے کے ناطے اصلی مخاطب مسلمان ہی ہیں۔ اس روشنی میں اگر مکمل چوراسی آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ان آیات میں ہم مسلمانوں ہی کے ماضی وحال کے قصے بیان کئے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مخصوص واقعات مثلاً گئو سالہ پرستی وغیرہ، بھی ہمارے اپنے ہی ماضی اور حال کے واقعات بن گئے ہیں۔

اگر ہم اس حصہ کے مجموعۂ آیات پر گہری نگاہ ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ انہیں ان کے باہمی ربط کی بنیاد پر مزید تین ذیلی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جس کی رو سے ہم انہیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

پہلے ذیلی حصہ میں جو ۴۰ تا ۴۶ آیات پر مشتمل ہے۔ بنی اسرائیل کو عمومی دعوت دی گئی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک زوال آمدہ مسلم امہ کو کس طرح ایک اعلیٰ اور معیاری اسلوب میں دعوت دی جانی چاہئے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دعوت کا اسلوب اور اسکے موضوعات کیا ہوں۔ اس کے لئے کیا اصول اپنایا جائے اور اس کی ترجیحات کیا ہوں اس طرح یہ حصہ زوال پذیر امت کو حیات نو اور نشاط تازہ سے ہمکنار کرنے کے طریقے اور اسکے مختلف مراحل کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دعوت واصلاح کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہئے۔ مثلاً غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کے خلاف بغیر کسی اشتعال انگیز گفتگو کے، کس خوبی کے ساتھ ان کی بڑی بڑی خامیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کردیا گیا ہے۔

قرآن مجید سب سے پہلے انہیں ان انعام واکرام کو یاد دلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے

ان پر ہدایات کی صورت میں کیا تھا اور اسکے نتیجہ میں انہیں اس کی شکر گزاری پر ابھارتا ہے پھر ان سے زور دے کر کہتا ہے کہ وہ اس ربانی ہدایت کو قبول کر کے اللہ سے کئے ہوئے اپنے عہد کو پورا کریں۔ بنیادی طور پر اس طرح کی ہدایت اور یاددہانی کسی بھی تحریک بلکہ ہماری امت مسلمہ کو بھی حیات تازہ سے ہمکنار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ پھر قرآن مجید انہیں سب سے آگے بڑھ کر دعوت ایمان قبول کرنے اور اس کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے کیوں کہ وہ مسلم ہونے کے دعویدار ہیں۔ البتہ ان کا یہ ایمان نبی آخرالزماں اور اس کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لانے پر موقوف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ باجماعت نماز کا اہتمام کرو، زکوۃ ادا کرو اور اپنی زندگیوں کو ایمان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرو نیز نفاق سے بچو کیوں کہ یہ ایمان کے لئے کینسر ہے۔ تاہم جو بات بھی کہی گئی ہے اس میں الزامی اسلوب تم منافقین کے بجائے سوالیہ کیا تم۔۔۔ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ آخر میں وہ تکمیل عہد کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مطلوبہ ایمانی استقامت کے راز: صبر اور نماز، کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان دونوں کا اہتمام محض وہی شخص کر سکتا ہے جسے آخرت کی فکر اور خدا کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو۔

گہرے غور وفکر کے نتیجہ میں یقیناً آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس طرز کا خطاب پوری سورہ بقرہ میں امت مسلمہ سے بھی کیا گیا ہے اور ان دونوں کے خطاب میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سات آیات میں بعد میں آنے والی تفصیلات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔

دوسرے ذیلی حصہ میں، جو ۴۷۔۴۷ آیات پر مشتمل ہے، بنی اسرائیل کو ان واقعات وکردار کی یاددہانی کرائی گئی ہے جو ان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ہر واقعہ محض ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ اپنے آپ میں ایک سبق ہے اور ان کی

زندگی کے بعض اہم پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ان واقعات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر واقعہ ایک داستان عبرت پذیر ہے۔ان کے اندر ایک جہان معانی پنہاں ہے اور ان میں دلوں کے کچھ بڑے بڑے امراض، اخلاق و کردار کی خامیوں، کمزوریوں اور کچھ انحرافات کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ ان واقعات کو محض اتفاقیہ اور منتشر طور پر نہیں بلکہ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یوں بطور مثال سنہرے بچھڑے کے واقعہ کو مادی اشیا سے بطور معبود محبت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔(آیت:۵۱) یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام واکرام کے معاً بعد پیش آیا جو اس نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کی صورت میں کیا تھا تاہم ابھی کتاب اور عہد نامہ آنا باقی تھا۔ یہ محبت جب خدا کی محبت پر غالب آ گئی تو یہ زوال کا سبب بن گئی۔ من وسلویٰ کے کھانے سے انکار اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ربانی عہد کی تکمیل کے لئے جہادی زندگی قبول کرنے کو تیار نہ تھے کیوں کہ یہ زندگی عیش وعشرت اور پرسکون زندگی کے بجائے مشقت اور قربانیوں کی متقاضی تھی۔ بالآخر جہاد سے روگردانی، ذلت ورسوائی اور اقتدار سے برطرفی کا موجب ہوئی۔(آیت:۶۱)

اسی طرح اصحاب سبت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکر وفریب کی راہ اختیار کی (آیت:۶۵) اللہ تعالیٰ کے احکام کے باب میں جو کج بحثیاں کی گئیں اور گائے کی قربانی کے تعلق سے جو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی گئی، اسے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ شریعت سے انحراف اور اطاعت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ایک بار جب شریعت کو بے مصرف قرار دے کر اسے عملی زندگی سے نکال پھینکا جاتا ہے تو پھر شریعت کے باب میں انسان کا حساس اور متحرک دل جمود وتعطل کا شکار ہو کر پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ (آیت:۷۴)

اس پس منظر میں یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ اسی طرح ہماری امت مسلمہ بھی

شریعت سے انحراف کے نتیجہ میں اپنی متحدہ دشمن طاقتوں (خواہ وہ منگول رہے ہوں یا مغربی اقوام) کے سامنے سرنگوں ہوگئی اوراس کے قلوب پتھر ہو گئے۔

تیسرے ذیلی حصہ میں، جو ۷۵۔۱۲۳ آیات پر مشتمل ہے، بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہٹ کران کے دل ودماغ، عقیدہ وعمل اور عادات واطوار کی موجودہ حالت وکیفیت سے بحث کی گئی ہے۔اور خاص طور پران کا پیغمبر آخرالزماں ﷺ کے انکار ومخالفت کا رویہ زیر بحث آیا ہے، تاہم یہ بتادیا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اس طرح کے رویہ کی، تسلسل کے ساتھ، ایک لمبی تاریخ چلی آرہی ہے۔

اب آپ ان کے جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمائیں اوران میں سے ایک ایک پرغور کریں۔اس میں نہ صرف ایک مسلم امہ کے عروج وزوال کی پوری تصویر موجود ہے بلکہ عہد زوال میں مسلم امہ کی حالت وکیفیت کی گہری مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔بنی اسرائیل نے دانستہ طور پر حق کو سمجھنے اوراسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔مسلمانوں نے بھی یہی کیا۔عام یہودی خدا کی کتاب کے معنی ومفہوم اوراسکے احکام وپیغام سے پوری طرح تہی دامن ہوگئے اور اپنی خیالی دنیا الگ بسالی۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ (آیت:۷۸)ان کے فاضل علماء نے خدا کی کتاب کے متن میں تحریف کرکے حسب منشا معنی آفرینی کی تاکہ کچھ مادی انعام واکرام حاصل کرسکیں۔یہی کچھ مسلمان بھی کررہے ہیں۔(آیت:۷۹)ان کے مابین فرقہ پرستی کا بڑا فروغ ہوا۔انہوں نے کچھ ظاہری رسم ورواج کو مذہب کا نام دے کرحقیقی ایمان وعمل کویکسر نظرانداز کردیا۔ان کا حال یہ تھا کہ وہ خدا کی کتاب کا بعض حصہ تو مانتے لیکن بعض جوان کے ہوائے نفس پر گراں گزرتا اورانہیں راس نہ آتا، کلیتًا اپنی عملی زندگی سے خارج کردیتے تھے۔مسلمان بھی اس سے مختلف نہیں۔اسی طرح ہم جتنی بھی چیزیں دیکھتے جائیں ہرایک میں ہمیں اسی طرح کی مشابہت نظرآئے گی۔بالآخر ہمارے سامنے فیصلہ کن طور پر یہ ضابطہ سامنے

آتا ہے:

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں اور جو انکار کریں گے وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔'' (آیت:۱۲۱)

باب سوم: امت مسلمہ کو انبیائی مشن کی تفویض (آیات ۱۲۴۔۱۵۲)

مسلمانوں کو انبیائی مشن کی تفویض سے پہلے (آیت:۱۴۳)، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مقدس تاریخ اور ان کی مثالی زندگی کی سرگزشت، جو خدا کی مکمل مخلصانہ وفاداری اور اطاعت شعاری پر مبنی تھی، بیان کی گئی ہے۔ (آیات:۱۲۳۔۱۳۳) حضرت ابراہیمؑ کو بیت اللہ کا متولی اور نسل انسانی کا امام و پیشوا محض اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ جس امتحان میں بھی ڈالے گئے پورے اترے۔ یہ اعزازات انہیں وراثتاً نہیں ملے تھے اور نہ اس کی توقع ہی کی جاسکتی ہے۔ (آیات:۱۲۴۔۱۲۵) نئی امت حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا نتیجہ تھی جو انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی تھی:

''اے ہمارے رب ہماری ذریت میں تو اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا'' (آیت:۱۲۸)

مسلمان حضرت ابرہیمؑ کی اس میراث و مشن کے بھی وارث ہیں جو توحید اور خدا پرستی کی صالح روایات کا بہترین نمونہ ہے۔ اور یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ کوئی موروثی لقب نہیں کہ ان کی ذریت میں نسل در نسل وراثتاً منتقل ہوتا۔ بنی اسرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کی روش سے ہٹ کر خدا سے بے وفائی کی پاداش میں اپنے آپ کو اس ورثہ سے محروم کرلیا اور حضرت یعقوبؑ نے اپنے آخری وقت میں بستر مرگ پر انہیں جو نصیحت کی تھی اور جو مشن سونپا تھا اس کے پورا کرنے میں ناکام رہے۔ (آیت:۱۳۳)

نہایت تاکید کے ساتھ یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذہبی

ظاہرداری کی کوئی حیثیت نہیں۔اصل قدر و قیمت اس ایمان کی ہے جس میں مکمل خود سپردگی اور مخلصانہ وابستگی پائی جاتی ہو، کیوں کہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ وعمل کی بنیاد پر جانچا اور پرکھا جائے گا۔ یہ تمام تفصیلات بنی اسرائیل سے خرقہ امامت لے کر امت مسلمہ کو تفویض کرنے کا تناظر پیش کرتی ہیں۔

تحویل قبلہ۔یعنی نماز کا رخ بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قرار دیا جانا( آیات:۱۴۴۔۱۵۰)فی الواقع امت مسلمہ کو انبیائی مشن تفویض کرنے کی علامت ہے۔ٹھیک جس طرح بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی ان الطاف وعنایات کی یاددہانی کرائی گئی تھی جو اس نے ان پر ہدایت وکتاب کی صورت میں کی تھی،اسی طرح آخر میں مسلمانوں کو بھی یاددہانی کرائی گئی ہے۔:

''تو تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔میری شکر گزاری کرتے رہنا،میری ناشکری نہ کرنا''( آیت:۱۵۲)

غور کیجئے بعینہ اسی طرح کی یاددہانی بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی۔

باب چہارم:بنیادی ذاتی اوصاف اور دین وشریعت کے اساسی اصول( آیات:۱۵۳۔۱۷۷)

آیات ۱۵۳۔۱۶۲ میں عہد خداوندی کی تکمیل کے لئے فرد کے مطلوبہ بنیادی ذاتی اوصاف کی نشاندہی کی گئی ہے۔یہ اوصاف محض اس معنی میں ذاتی ہیں کہ فرد انہیں اپنے اندر خود اپنی ذاتی کوششوں سے پیدا کرسکتا ہے۔تاہم یہ اپنے اندر ایک اجتماعی پہلو بھی رکھتے ہیں جس کا اجتماعی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔مثلاً نماز اجتماعی طور پر باجماعت ادا کی جاتی ہے۔اسی طرح روزہ، حج اور جہاد بھی کہ ان میں اجتماعی پہلو بہت نمایاں ہے۔

شخصیت کی تعمیر کا سب سے اہم اور بنیادی وصف وذریعہ یہ ہے کہ آپ خدا کی یاد سے کبھی غافل نہ رہیں۔آپ کے شب وروز اس طرح گزریں کہ گویا آپ خدا کو اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ہر چیز کے باب میں آپ کا نقطۂ نظر یہ ہو کہ یہاں جو کچھ بھی

ہو رہا ہے اسی کی مرضی کے مطابق اور اسی کے حکم و اشارے پر ہو رہا ہے۔ اور یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ آخرت میں خدا کے حضور پیش ہونا ہے۔ مختصراً یہ کہ آپ زندگی کے ہر موڑ پر بلکہ ہمہ وقت اور ہر لمحہ جس قدر اور جس کثرت سے بھی خدا کو یاد کر سکتے ہوں یاد کریں حتیٰ کہ یہ زندگی کا وظیفۂ عمل بن جائے۔ یہ تمام باتیں واضح طور پر آیت ۱۵۲ میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ایمان کے اس معیار مطلوب تک پہونچنے کے لئے خدا کا ذکر زندگی کا لازمہ ہونا چاہئے اور نماز کا مقصود یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت ۱۵۲ کے معاً بعد یہ ہدایت کی گئی کہ 'صبر و نماز سے مدد چاہو' (آیت: ۱۵۳) یہاں صبر کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیوں کہ صبر کے بغیر نماز کا قیام و اہتمام، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ممکن نہیں۔ تاہم یہ نماز ہی ہے جو ایک مومن کے اندر صبر کی طاقت وقوت پیدا کرتی ہے، اسے فروغ دیتی ہے، سہارا دے کر استحکام بخشتی ہے اور صبر کے اس معیار کو برقرار رکھتی ہے جو عزم و استقلال اور ثابت قدمی کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میدان عمل میں دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ دونوں انفرادی و اجتماعی طور پر تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ نماز فرد و جماعت دونوں ہی کے حیات وقلوب کو خدا کے ذکر سے معمور کر دیتی ہے۔ جیسا کہ آیت ۱۵۳ میں یقین دہانی کرائی گئی ہے 'اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' پھر دیکھئے اسی طرح کی ہدایت بنی اسرائیل کو بھی دی گئی تھی۔ (آیت: ۴۶)

صبر کی تلقین سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ربانی عہد کی تکمیل کے لئے قربانیاں درکار ہیں۔ ان قربانیوں کی کسی قدر تفصیل آیت ۱۵۵ میں بیان کی گئی ہے۔ اور بالآخر انتہائی قربانی جو مطلوب ہے وہ جان کی قربانی ہے۔ آزمائشوں اور قربانیوں کے موقع پر عزم و استقلال اور ثابت قدمی کے مظاہرہ کے لئے اللہ کا ذکر صبر کے حصول کی کلید ہے۔ یہ ذکر ہمارے اندر یہ احساس و شعور پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنے تمام امور میں

کلیتاً خدا کے محتاج ہیں اور مرنے کے بعد ہمیں اُسی کے پاس لوٹ کر جانا اور اپنے تمام اعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔ یہی احساس وشعور نماز بھی ہمارے اندر پیدا کرتی ہے۔

صفا اور مروہ سے متعلق آیت ۱۵۸ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے گو کہ بظاہر بے محل لگتا ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ جوار کعبہ میں صفا اور مروہ کی یہ دونوں پہاڑیاں صبر ورضا اور اعتماد وامید کی ایک عظیم داستان سے عبارت ہیں۔ ان سے ایک عظیم قربانی کی داستان بھی وابستہ ہے یعنی حضرت ہاجرہ اور اسماعیلؑ کی داستان۔ چنانچہ جب ایک شخص صفا اور مروہ کے مابین سعی کرتا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیوں کر حضرت ہاجرہ نے تنہا اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ مکہ میں رہنے کا فیصلہ کیا اور کس اعتماد وامید کے ساتھ انہوں نے تمام حالات کا مقابلہ کیا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس وادیٔ بے آب وگیاہ میں جہاں دور دور تک پانی کے آثار نہ تھے، آب زمزم کا چشمہ جاری کر دیا؟

آخیر میں قرآن مجید سے متعلق عہد شکنیوں کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے اور ایسا شخص جو اس جرم کا مرتکب ہو، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور تمام بنی نوع انسان کی طرف سے لعنت اور آخرت میں دردناک عذاب کا مستحق ہوگا۔ (آیات: ۱۵۹۔۱۶۲) اس سخت دھمکی کا اطلاق اس تناظر میں کی گئی تمام باتوں پر ہوتا ہے۔ خدا کا ذکر، نماز، قربانی، جہاد اور صبر یہ تمام ہی چیزیں امت کے تفویض شدہ مشن کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس لئے امت کے ہر فرد کو اس مشن کی تکمیل کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دینی چاہئے۔

آیات ۱۶۳۔۱۷۷ میں دین وشریعت کی بنیاد واساس سے بحث کی گئی ہے۔ یعنی خدا ایک اور وحدہ لاشریک ہے اور پوری کائنات اسی کی شہادت دے رہی ہے۔ اور یہی چیز تقویت ایمان کا باعث ہے۔ (آیات: ۱۶۳۔۱۶۴) خدا سے رشتہ مضبوط اور استوار رکھنا، یہ دین کی بنیاد اور اس کا لازمہ، صراط مستقیم پر قائم رہنے کے لئے شرط اولیں

(آل عمران:۱۰۱)، جہاد کا بنیادی عنصر، (الحج:۷۸) اور شہادت حق کی اساس ہے۔

توحید کے ذکر کے معاً بعد قرآن مجید کا رخ خدا سے محبت کی طرف مڑ جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی محبت سے بڑھ کر کسی اور چیز کی محبت نہیں ہونی چاہئے۔ یوں قرآن مجید ذکر وصبر کے بعد خدا کی محبت کو سب سے اہم اور اعلیٰ وصف قرار دیتا ہے کیوں کہ فی الواقع یہی محبت فرد کے ایمان کو حقیقی اور بامعنی بناتی ہے۔ (آیت:۱۶۵) اور یہ محض اسی کا کمال ہے کہ ایمان کو دلوں میں جاگزیں کر کے شخصیت کا حصہ بناتی اور خدا کے منشا کے مطابق زندگی گزارنے کی طاقت وسلیقہ بخشتی ہے۔

ایمان کا تقاضا ہے کہ دوسرے تمام لیڈروں کو چھوڑ کر خدا کے بھیجے ہوئے رسول کی اطاعت وپیروی کی جائے (آیات:۱۶۶۔۱۶۷) محبت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ''محبوب'' کے احکام بجالائے جائیں۔

اب شریعت کے کچھ اہم اصول ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ روئے زمین پر پائی جانے والی تمام اچھی چیزیں فی نفسہ جائز اور حلال ہیں سوائے ان چیزوں کے جن کا استعمال ممنوع ہے۔ (آیت:۱۶۸) بنیادی طور پر اس اہم اصول کا تعلق محض اشیاء خورد ونوش تک محدود نہیں بلکہ یہ تمام شعبہ ہائے حیات کے جملہ امور پر محیط ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی چیز کو ناجائز اور حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ حق کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔ (آیت:۱۶۹)

۳۔ تیسرے یہ کہ متعین طور پر وہی چیزیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، حرام ہیں بقیہ تمام چیزیں جائز اور حلال ہیں۔ (آیت:۱۷۳)

۴۔ چوتھے یہ کہ ناگزیر انسانی ضرورت کے تحت ناجائز اور حرام چیزوں میں بقدر ضرورت استعمال کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ (آیت:۱۷۳)

۵۔ پانچویں یہ کہ اخلاقی اصول وضوابط نہایت اہم ہیں اور ان میں، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ان کا تعلق اپنی ہی نوع انسان کے حقوق وفرائض سے ہو، ذرا بھی نرمی نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً عہد شکنی کا جرم ناجائز اور حرام چیزیں کھانے سے زیادہ سنگین ہے۔ (آیت: ۱۷۴)

تاہم زندگی کی تمام تر عبادت واطاعت کی بنیاد تقویٰ ہے۔ یہیں سے آیت ۱۷۷ میں تقویٰ کی ایک جامع تعریف کی گئی ہے کہ تقویٰ ہے کیا؟ یہ آیت ۲۔۵ کی توسیع اور آئندہ حصہ کی تمہید ہے کیوں کہ تقویٰ جیسا کہ یہاں بیان کیا گیا، آئندہ تمام بحثوں کی بنیاد اور محرک ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایمان وانفاق بھی زیر بحث آیا ہے اور ایفائے عہد اور ہر حال میں صبر کو بنیادی وصف ومعیار قرار دیا گیا ہے۔

## باب ۵: اجتماعی زندگی: اصول وضوابط اور ادارے (آیات ۱۷۸۔۲۴۲)

اجتماعی زندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ امت مسلمہ کے مشن کی تکمیل اور انفرادی و اجتماعی سطح پر افراد امت کے اندر جن اوصاف وکمالات کو پیدا کرنے اور فروغ دینے کی ضرورت ہے، یہ اس کے لئے ایک مستحکم اساس اور موزوں اور سازگار ماحول فراہم کرتی ہے۔ اس لئے افراد کے دل ودماغ اور قلوب واذہان ہی کی طرح ان کی معاشرتی زندگی بھی تقوی میں ڈھلی ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں قرآن مجید ان تعلیمات اور اصول وضوابط کی نشاندہی کرتا ہے جس سے یہ تقوی فروغ پاتا ہے۔

زندگی اور جائداد سے بے پناہ محبت یہ معاشرتی زندگی میں اتحاد و یکجہتی کی دو اہم بنیادیں ہیں، آیات ۱۷۸۔۱۸۲ میں اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس کے معاً بعد رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے تا کہ تقوی اور ضبط نفس کی وہ صلاحیت فروغ پا سکے جس کی بنیاد پر ایک شخص انسانوں کے باہمی روابط میں اپنے آپ کو

خدا کی ٹھہرائی ہوئی حدود سے تجاوز کرنے اور ظلم وتعدی سے باز رہنے کی سعی کرتا ہے (آیات:۱۸۳۔۱۸۷) کھانے پینے اور زن وشو کے تعلقات قائم کرنے سے روکنا اصل مقصود نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد ایسی روحانی طاقت کوفروغ دینا ہے جو ایک فرد کو دوسرے کی جان و مال اور عزت وآبرو سے احتراز کرنے کا اہل بنائے۔ اس لئے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (آیت:۱۸۸)

''تم ایک دوسرے کا مال غلط طریقے سے نہ کھاؤ۔''

حج کا جہاد سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ (آیات:۱۹۶۔۲۱۸) اپنی فطرت وہیئت کے اعتبار سے دونوں میں بڑی گہری مماثلت ہے۔ دونوں ہم سے قربانی چاہتے ہیں۔ دونوں گھربار، اعزا واقربا کو خیر باد کہنے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے سفر کرنے اور سرگرم عمل رہنے اور اس کے لئے مال ودولت خرچ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جہاد کے لئے خرچ کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ جہاد نہ صرف معاشرہ کی حیات وزندگی اور اسکی طاقت وقوت کا باعث بلکہ اس کے مشن کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے جہاد کے لئے خرچ کرنا معاشرہ کو تباہی و بربادی سے بچانے اور زوال وانحطاط سے تحفظ عطا کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ (آیات:۱۹۵) یہاں محض جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور جہاد کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ (آیات ۱۹۰۔۱۹۲) اس کے بعد مضمون کا رخ حج کی طرف مڑ گیا ہے اور اس کی اہم اور نمایاں خصوصیات کی روشنی میں اس کی بنیادی تعلیمات کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے (آیات:۱۹۶۔۲۰۳) اور اس کے بعد جہاد کے مقاصد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جہاد دراصل ان بدعنوان قائدین کے خلاف بنی نوع انسان کے تحفظ کے لئے ناگزیر ہے جو سیاسی طاقت کا بے دریغ اور ناجائز استعمال کرتے ہیں، جو خود پسند ہوتے ہیں اور اپنی وضع پر سختی سے قائم رہتے ہیں، جو روئے زمین پر ظلم وزیادتی، فتنہ وفساد اور قتل وغارت گری کو فروغ دیتے اور عوام کی بدحالی کا موجب ہوتے ہیں۔ (آیات:۲۰۴۔۲۰۶)

جہاد کی ضرورت، نوعیت اور مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ جہاد تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو مکمل طور پر رضائے الٰہی کے حوالہ کردیں۔ (آیات: ۲۰۷۔۲۰۸) جہاد میں ہمیں بار بار آزمایا جائے گا اور ہم سے عظیم قربانیوں کا مطالبہ کیا جائے گا اور فی الواقع ہم اپنے اسلاف جیسی قربانیاں پیش کئے بغیر کبھی بھی جنت کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ (آیت: ۲۱۴) کسی کا خون بہانا بلاشبہ قابل نفرت ہے تاہم مذہبی تعذیب اس سے بھی بڑا سنگین جرم ہے۔ (آیات: ۱۹۳۔۲۱۷)

اس کے بعد کلام کا رخ جوئے اور شراب کی طرف مڑ جاتا ہے (آیت: ۲۱۹) شراب خوری انسان کو معاشرتی ذمہ داریوں سے بچنے اور غیر متاہلانہ زندگی گزارنے سے گریز کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اور جوا سے حرص وطمع کو ترغیب ملتی ہے اور بغیر محنت ومشقت کے دولت حاصل کرنے کی خواہش میں اضافہ ہوتا ہے۔ گو بذات خود دونوں بری چیز ہیں تاہم یہاں ان کے ذکر کا محل یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں راہ جہاد میں سد راہ ہیں۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام معاشرہ کے سب سے زیادہ مظلوم طبقہ یعنی یتیم وخواتین کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس نسبت سے عائلی زندگی کے اصول وضوابط تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ (آیات ۲۲۰۔۲۴۲) کیوں کہ یہ سماج ومعاشرہ اور تہذیب وثقافت دونوں کے لئے بنیادی اساس ہیں۔ خاندان سماجی اتحاد ویکجہتی کو قائم رکھتا ہے اور اس کے مقاصد، اصول وضوابط اور اقدار وروایات کو استحکام بخشتا ہے اور اسے نسل درنسل منتقل کرتا ہے، متحد ومستحکم اور عدل وانصاف پر مبنی عائلی زندگی افراد معاشرہ کو محض جہاد ہی کے لئے نہیں تیار کرتی بلکہ اس کے، بنی نوع انسان کے مابین قیام وعدل وانصاف کے مقاصد کو بھی پورا کرتی ہے۔

## باب ۶: (آیات: ۲۴۳۔۲۸۳)

کون سی چیزیں ملک ومعاشرہ کو بقاواستحکام بخشتی اور کامیابی سے ہمکنار کرتی ہیں۔

اس سورہ کا آخری بڑا حصہ اسی اہم سوال پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ یہ سوال سورہ کے عمود ''امت مسلمہ کا مشن'' کے حوالہ سے نہایت اہم ہے۔ شروع میں چند عمومی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ سب سے پہلے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ایک خاص مقصد اور مشن ہے۔ جہاد دراصل اسی مقصد و مشن کے لئے ایک سرگرم جدوجہد اور بھرپور سعی و کوشش کا نام ہے۔ انفاق و جہاد کا امت مسلمہ کے عروج وزوال اور فنا و بقا میں بڑا اہم اور بنیادی رول ہے۔ دونوں کا تقاضا ہے کہ لوگ عزم و حوصلہ، صبر و تحمل اور نظم وضبط سے کام لیں اور مادی چیزوں بالخصوص دولت کی محبت پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ ان نکات کو آیات ۲۴۳۔۲۸۳) کے تحت نہایت موثر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

موت کا خوف اور مادی چیزوں سے غایت درجہ محبت یہ دونوں چیزیں معاشرہ کے استحکام و بقا کے لئے نہایت تباہ کن ہیں۔ اگر لوگ موت سے ڈرتے ہیں تو موت ان کے معاشرہ کا مقدر بن جاتی ہے اور جو موت سے نہیں ڈرتے، زندگی ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کے حوالہ سے آیت ۲۴۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ یوں قرآن مجید مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور اس کے لئے جو کچھ بھی تم مال خرچ کر سکتے ہو کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے مال کو بطور قرض قبول کرے گا اور اسے کئی گنا بڑھا کر تمہیں واپس کرے گا۔ (آیات: ۲۴۴۔۲۴۵)

ایک زوال آمدہ اور مردہ معاشرہ میں بھی زندگی کی روح پھونکی جا سکتی ہے اور اسے بھی ایک زندہ معاشرہ بنایا جا سکتا ہے اس حقیقت کو تین واقعات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ حضرت داوٗدؑ اور جالوت کا واقعہ (آیات: ۲۴۶۔۲۵۰)

۲۔ ایک مردہ بستی کے زندہ ہونے کا واقعہ (آیت: ۲۵۹)

۳۔ مردہ کو زندہ کرنے کے حوالہ سے حضرت ابراہیمؑ کی حیرت اور اس کے جواب

کا واقعہ (آیت: ۲۶۰)

(روزہ اور جہاد کے اصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے) صبر وتحمل اور نظم وضبط کے ذریعہ ایسے لوگ جو تعداد میں کم اور وسائل سے محروم ہوں، بسا اوقات تعداد کی کثرت اور وسائل وذرائع اور طاقت وقوت سے مالا مال افراد پر غالب آجاتے ہیں۔ جیسا کہ جالوت کے خلاف حضرت داؤد علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے کردکھایا تھا۔ (آیات: ۲۴۶۔۲۵۳)

انفاق کے مختلف پہلوؤں، یعنی اپنے مال واسباب اوران کے علاوہ جو کچھ بھی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرسکتا ہے، کوآیات: ۲۶۱۔۲۷۴ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سود کی ممانعت اور تنازعات سے مبرا معاشی لین دین کوقطعی بنانے کے اقدامات، دولت کے تئیں اس کے عمومی رویہ اوررجحان کا پتہ دیتے ہیں۔ (آیات: ۲۷۵۔۲۸۳)

ان آیات کے بیچ میں آیت الکرسی کو ہیرے جواہر اور موتیوں کے نیکلس کے بیچ میں نگینہ کی طرح جڑ دیا گیا ہے۔ (آیت: ۲۵۵) خدا پر یقین کامل کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے اس آیت میں ان تمام چیزوں کو جمع کر دیا گیا ہے اوران چیزوں کا بھی ذکر کردیا گیا ہے جن سے جہاد اور انفاق کو تقویت ملتی ہے۔ اب آپ کو نہ اپنے دشمنوں کی دولت وثروت اور طاقت وقدرت سے ڈرنے اور مرعوب ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اپنی زندگی کو کھونے یا غریب ہونے کے اندیشے سے فکرمند ہونے کی کیوں کہ اللہ تعالیٰ حی وقیوم ہے۔ وہ ہمیشہ رہنے والا ہے اوراس کی ذات سرچشمۂ حیات ہے۔ وہ خود قائم بالذات ہے اور تمام لوگوں کو قائم رکھنے اور حیات بخشنے ولا ہے اوراس کا علم اوراس کی قدرت زمین وآسمان کی تمام چیزوں پر محیط ہے۔

**باب ۷: خلاصہ: اخلاقی اور روحانی اوصاف وذرائع (آیات: ۲۸۴۔۲۸۶)**

وہ کون سے ذرائع ہیں جو افراد ومعاشرہ کو خدا کی مرضی کے مطابق بخوشی زندگی

گزارنے پر آمادہ کرتے اور اس کے مشن کی تکمیل کے لئے سینہ سپر ہوجانے کا جذبہ پیدا کرتے اور اس راہ میں حائل تمام مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں؟

ان اوصاف و ذرائع کو آخری تین آیات میں سمودیا گیا ہے۔ایسے تمام اخلاقی وروحانی اوصاف وذرائع جن کے بغیر اس عظیم کام اور مشن کی تکمیل ممکن نہیں، بیان کردئے گئے ہیں۔یہی وہ اوصاف وذرائع ہیں جن کے بل پر ہم اپنے اندر عزم وحوصلہ اور صبر واستقامت کا وہ جوہر پیدا کرلیتے ہیں جو ہمیں سورہ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا اہل بنادیتا ہے۔

ان اوصاف وذرائع میں سب سے اہم وصف وذریعہ ایمان ہے اور فی الواقع یہی تمام اوصاف وذرائع کا واحد اور بنیادی مرجع وسرچشمہ ہے۔ایمان محض زبانی اقرار کا نام نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی میں تنہا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مرجع قرار پائے۔امید وبیم اور خوف ورجاء میں ہم اسی کی طرف رجوع کریں۔اسی کو اپنا خالق ومالک جانیں اور اسی سے اپنے تعلقات استوار اور مستحکم کریں۔اس کے نتیجہ میں ہمارے اندر وہ اوصاف وکمال اور وہ صلاحیت وقابلیت اور طاقت وقوت پیدا ہوگی جو صراط مستقیم پر گامزن رہنے (آل عمران:۱۱۰) اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔(حج:۷۸)

خدا سے اس خصوصی تعلق کو ان تین مختصر آیات میں نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کردیا گیا ہے۔ان آیات کو نہ صرف آسانی سے یاد کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے نقوش لوح دل پر ثبت کئے جاسکتے ہیں۔آیئے دیکھیں کہ ان آیات میں ہمیں کیا تعلیم دی گئی ہے۔

اول: ان آیات میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ ''زمین وآسمان میں جو کچھ ہے اس کا تنہا مالک اللہ ہے'' یہ چند گنتی کے الفاظ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتے ہیں۔اگر ہم انہیں ٹھیک سمجھ لیں اور اپنے فکر کا حصہ بنالیں تو ہمارے فکر ونظر میں انقلاب آجائے گا۔ہمارا رویہ یکسر تبدیل ہوجائے گا اور کائنات کی تمام چیزوں بشمول اپنی ذات سے تعلق ورشتہ کی نوعیت بدل جائے گی۔ہمیں اپنے اندر جس

باطنی طاقت وقوت کو پیدا کرنے اور اس کو مستحکم اور برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، یہ آیات اس کے لئے کافی ہیں۔ ان الفاظ کے اندر جو جہان معانی پنہاں ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ہم امین ہیں مالک نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے۔ ہماری تمام چیزیں اور تمام رشتے ناتے حتی کہ ہمارے جسم وجان سب اسی کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے اس کا اصل مالک وہی ہے ہم نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے اسی کا ہو جانے میں ہم اپنے اندر بے پناہ طاقت وقوت محسوس کرتے ہیں اور پھر ہمارے زندگی گزارنے کا انداز اور خوشی وناراضگی کا معیار محض اسی کی ذات قرار پاتی ہے۔

۲۔ اس تصور کے ساتھ کہ ہم امین ہیں مالک نہیں۔ یقیناً ہم زندگی کی ہر چیز استعمال کرتے ہیں لیکن منشاء الٰہی کے مطابق۔ اس سے ہمارے اندر ہر چیز اور ہر معاملہ میں اس کی اطاعت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

۳۔ زندگی میں ہمیں جو کچھ بھی میسر ہے وہ اسی کا عطا کردہ ہے اور جو کچھ بھی ہم حاصل کرتے ہیں اسی کی مرضی اور توفیق سے۔ یہ احساس ہمیں اس کی شکر گزاری پر مجبور کرتا ہے۔

۴۔ یہ شعور ہمارے اندر تمام مخالفتوں کا سامنا کرنے اور ہر قسم کی آزمائشوں پر صبر کرنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔

۵۔ امین ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے تمام اعمال میں خدا کے سامنے جواب دہ ہیں اور یقیناً ایسی تمام چیزوں کی بابت ہم سے باز پرس ہوگی جو ہماری تحویل میں ہیں حتی کہ ہم نے اپنے نہاں خانۂ دل میں جو کچھ چھپا رکھا ہے اس کی بابت بھی سوال ہوگا۔ یوں ہماری نگاہ ہمیشہ یوم آخرت پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم اس وقت کی تیاری میں لگے رہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری پیشی ہوگی۔

۶۔ یہ محض خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اسی کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے وہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں پر ہمیں سزا دے یا معاف فرمادے، یہ احساس ہمیں اپنے ہی

جیسے انسانوں کے فیصلے سے بے خوف و بے نیاز کر دیتا ہے۔

۷۔ اگر ہماری تقدیر کا آخری اور قطعی فیصلہ آخرت ہی میں ہونا ہے تو پھر ہماری امید وبیم اور خوف ورجا کا معاملہ تنہا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سے وابستہ ہے اس لئے ہمیں اپنی آزمائشوں میں ناکامی اور معاصی کے ارتکاب میں اسی سے توبہ ومغفرت کے طلب گار ہونا چاہیئے۔

یہ تمام مذکورہ بالا باتیں ان تین آیات میں بیان کر دی گئی ہیں۔

دوم: ایمان کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

سوم: ایمان کو ایک ٹھوس شکل دے دی گئی ہے۔ اسے محض تصوراتی چیز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ایمان دراصل اللہ اور اس کے رسول کی سننے اور اطاعت کرنے کے عہد ومعاہدہ کا نام ہے۔

چہارم: عہد الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کی عظیم ذمہ داری اور انسان کا طبعی طور پر گناہ کا رجحان رکھنے کی وجہ سے ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم پوری یکسوئی کے ساتھ ہمیشہ اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اپنے تمام کاموں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جو غلطی سرزد ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے خفیہ اور اعلانیہ ہر طرح سے توبہ واستغفار کرتے رہیں۔ اس سے ہمارے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوگا اور ذاتی اصلاح، خود احتسابی اور اس باب میں پوری طرح چوکنا رہنے کا شعور فروغ پائے گا۔

اس کے علاوہ آخری آیت ۲۸۶ میں آرام وسکون اور حمایت ونصرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات جس کی ضمانت دی گئی ہے اور جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالے گا جسے ہم اٹھا نہ سکیں یا کسی ایسی آزمائش میں مبتلا نہیں کرے گا جس کے ہم متحمل نہ ہوں خواہ یہ شریعت پر عمل واطاعت کا معاملہ ہو یا میدان جنگ میں جہاد کا یا خدا کی راہ میں کوئی اور قربانی پیش کرنے کا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس آیت میں تکلیف مالا یطاق سے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہمارے دل میں یہ خیال

راہ نہیں پا سکے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس کام کا حکم دیا ہے وہ ہمارے بس سے باہر ہے الا آنکہ ہم خود اپنے دل میں اس طرح کے خیال کو جگہ دیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ جو کام ہم بذات خود انجام دیں گے اسی کے ذمہ دار ہوں گے اور اسی کی بابت ہم سے باز پرس ہوگی دوسرے کے عمل کی ذمہ داری ہمارے سر نہ ہوگی۔

۳۔ تیسرے یہ کہ شریعت کے احکام یا اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشیں ایسی نہیں ہوگی جس پر عمل کرنا ہماری طاقت سے باہر ہو۔

۴۔ چوتھے یہ کہ ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکام وہدایت کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے اپنے اعمال کی ممکنہ کوتاہیوں پر اس سے عفو وکرم اور رحمت ومغفرت کی دعا کرتے ہیں۔خدا پر اس درجہ اعتماد وبھروسہ کے نتیجہ میں بندہ کے اندر یہ خیال راہ نہیں پا سکتا کہ وہ خدا کی توفیق اور اس کی نصرت وعنایت کے بغیر اپنے بل بوتے پر کچھ کر سکتا ہے۔آخری بات یہ کہ ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی دعا کرتے رہیں۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس امت کو جو مشن تفویض کیا گیا ہے اس میں جہاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہ تمام تعلیمات ایک مختصر دعا کی صورت میں عطا کی گئی ہیں ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہمیں جن چیزوں کو مانگنے کی تعلیم دے رہا ہے وہ یقیناً ہمیں عطا بھی کرے گا اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جس میں ذرہ برابر بھی شک کا امکان نہیں۔

## کچھ اہم بنیادی نکات:

اب ہم پوری سورہ پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہیں۔گو کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس سورہ کا مرکزی موضوع بنی نوع انسان کے سامنے گواہ کی حیثیت سے امت مسلمہ کے مشن کا تعارف کرانا اور اسے کچھ ایسے اہم انفرادی، اجتماعی اور داخلی اوصاف سے متصف کرنا ہے جن کے ذریعہ وہ بآسانی اپنے مشن کی تکمیل کر سکے۔تاہم اگر ہم اس سورہ پر مزید غور کریں تو

ہمارے سامنے کچھ ایسے مرکزی موضوعات آئیں گے جو ہر گفتگو اور ہر بحث میں اساسی اہمیت کے حامل ہونگے۔آیئے ان پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

## دل کی مرکزیت:

گو کہ سورہ میں اجتماعیت پر زور دیا گیا ہے تاہم سورہ بقرہ انفرادی طور پر اپنے تمام مباحث میں افراد کے دل کو مرکزی حیثیت قرار دیتی ہے۔یہ افراد کے تمام امراض وصحت کا مرکز ومنتہا ہے۔یہ تمام اہم مہمات سر کرنے کا وسیلہ وذریعہ اور تمام کارہائے نمایاں انجام دینے کی کلید ہے۔دل کو بالآخر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہونچائے اور ان تمام امور کو سرانجام دے جس کی قرآن مجید اپنے متبعین کو تعلیم دیتا ہے۔

دیکھئے: ایسے تمام لوگ جو دیدہ ودانستہ حق کو مسترد کرنے والے رہے ہیں اللہ تعالی نے انہیں قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔اسی وجہ سے بالآخر اللہ تعالی نے ''ان کے دلوں پر مہر بھی لگادی'' (آیت:۷) ایسے تمام لوگ کہ جو منافقت کی راہ اختیار کرتے ہیں،ان کی منافقت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ''ان کے دل بیمار ہیں'' (آیت:۱۰)۔وہ لوگ جو اپنے مشن سے روگردانی کریں اور عہد شکنی کے مرتکب ہوں۔جیسے بنی اسرائیل یا مسلمان تو پھر نتیجے کی طور پر ''ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو جائیں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ''۔(آیت:۷۴) جو اللہ تعالی کی اطاعت نہیں کرتے ہیں وہ اطاعت اس لئے نہیں کرتے کیوں کہ ''ان کے دل بچھڑے کی محبت سے سرشار ہیں'' (آیت۔۹۳) یہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول حق کیلئے انہیں آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔یہ حق کو تسلیم نہیں کرسکتے اور نہ حق ان پر کچھ بھی اثر انداز ہوگا۔اس طرح جو بھی شہادت چھپاتا ہے ''اس کا دل گناہ ومعصیت سے پر ہے'' (آیت:۲۸۳)

دوسری طرف وہ لوگ جو ہدایت ورہنمائی کے مستحق ہیں یا جو کتاب الہی کے

ذریعے راہ یاب اور ہدایت یافتہ ہیں یہی لوگ متقی ہیں اوران کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیب میں یعنی بن دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں (آیت :۲۔۳) غیب ان حقائق کا نام ہے جو انسانی محسوسات وادراک سے ماوراء ہے یعنی کسی انسانی تصور کی پہونچ سے پرے، کسی عقل وشعور، دلیل ومنطق اور سائنسی طریقہء کار یا حکیمانہ تجربہ سے بالاتر۔ جیسے اللہ، وحی، آخرت اور فرشتے وغیرہ۔ ان کی بابت ہمیشہ ذہن میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں ۔ایمان یعنی اس طرح کے غیر مرئی حقائق کو تسلیم کرنے اور ماننے کے عمل کا تعلق محض دل ہی سے ہوسکتا ہے۔ یہ محض دل ہی ہے جو مطلق رسول پر اعتماد کرتے ہوئے عقیدہ کی یہ جست لگا سکتا اور اسے برحق تسلیم کرسکتا ہے۔ یوں ایمان محض دل ہی میں نشونما پا سکتا ہے۔ سورہ بقرہ میں شروع سے آخر تک ہر جگہ ہم رسول پر مطلق اعتماد کی بنیاد پر ایمان کے اس نکتہ کو پاتے ہیں ۔ایمان ایک ایسا سر رشتہء اتحاد ہے جو معاشرہ کو متحد و منظم کرتا ہے، اور اسے بامعنی بناتا ،ہدایت دیتا، مقصد متعین کرتا، استحکام، بخشا اور تشخص عطا کرتا ہے۔ تقوی ہر معنی میں ہدایت ربانی کے شرط اولیں بھی ہے اور مقصود منتہا بھی ۔ایمان کے پہلو بہ پہلو پوری سورہ میں اکثر یہ نکتہ بار بار سامنے آتا ہے۔ تقوی بھی دل کی ایک لازمی خوبی ہے۔ اس کی جڑیں ایمان میں پیوست ہیں: خدا کی ذات صفات اور آخرت پر ایمان: یہی ایمان ہے جو تقوی کو تقویت بخشا اور ترقی دیتا ہے۔ (آیات: ۲۱، ۶۳، ۱۷۳، ۱۹۷، ۴۸، ۱۲۳، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۸۱)۔

## قوانین ورسومات کی روح پر زور

گرچہ سورہ متعدد مذہبی رسومات اور قانونی احکام کا ذکر کرتی ہے اور اس کی مکمل اور مطلق اطاعت کا مطالبہ کرتی ہے پھر بھی وہ مزید اس بات پر زور دیتی ہے کہ جو چیز واقعی مطلوب اور جو اللہ تعالی کے یہاں قابل قدر ہے وہ دراصل تمام مذہبی رسومات اور قانونی

اعمال وافعال کی ظاہری ہیئت کے پس پردہ کارفرماں روح اور جذبہ عمل ہے۔ چنانچہ سورہ میں اکثر مذہبی ظاہر داری اور روحانیت سے عاری زہد وتقوی کی مذمت کی گئی ہے اور دل و جان کو مکمل خدا کے حوالہ کردینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

مثلاً رسم ورواج اور قوانین کا باب شروع کرنے سے پہلے یہ واضح کردیا گیا ہے کہ نیکی اور خدا سے وفاداری محض مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تو فی الواقع ایمان لانے، خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے، نماز پڑھنے، زکوۃ دینے، وعدہ وفا کرنے اور کسی بھی آزمائش میں صبر واستقامت کا ثبوت دینے کا نام ہے اور صحیح معنوں میں ان اوصاف سے متصف افراد ہی اپنے عقیدے میں سچے اور متقی و پرہیزگار ہیں (آیت ۔۱۷۷) سورہ مزید یہ کہتی ہے کہ نیکی اور وفاداری یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں پچھلے دروازہ سے داخل ہو بلکہ نیکی اور وفاداری، تقوی اور خداترسی کا نام ہے۔ (آیت: ۱۶۹) اسی طرح یہ سورہ ایک طرف مسلمانوں کو نماز ادا کرتے وقت مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کی ہدایت دیتی ہے لیکن دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ ہر فرقہ ومذہب کا ایک قبلہ ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ جو چیز تمھیں خدا کی نگاہ میں معتبر اور مقام ومرتبہ میں ممتاز کرنے والی ہے وہ کسی خاص سمت کی طرف رخ کرنا نہیں بلکہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت کرنا ہے۔ (آیت: ۱۴۸)

اسی تناظر میں مذہبی نمائش کیلئے کچھ رسومات پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے اور بعض بنیادی اہمیت کی حامل ہدایات کی خلاف ورزی کرنے کی نہایت سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے مثلاً جان ومال کا تقدس بنیادی طور پر بڑا اہم ہے۔ تاہم تمہارا حال یہ ہے کہ "اپنوں ہی کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو پھر اگر وہ گروہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی

تمھارے لئے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو۔ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کے حوالہ کر دئے جائیں گے (آیات:۸۴-۸۵)

اسی طرح حرام مہینوں میں جنگ کرنے کو ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ لوگوں کو خدا کے راستے سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور لوگوں کو مسجد حرام تک پہنچنے سے باز رکھنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا خدا کی نگاہ میں اس بھی بڑا جرم ہے (آیت۔۲۱۷) مزید برآں باہم لڑنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا بجائے خود انتہائی شرمناک بات ہے، لیکن ایذا رسانی اس سے بھی بڑھ کر شرمناک ہے۔ (آیات ۱۹۳، ۲۱۷) تاہم اگر تمہیں لڑنا ہی ہو تو حد اعتدال سے تجاوز نہ کرو کیوں کہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (آیت:۱۹۰)

## رائج مذہب اور علیحدگی پسندی

یہ سورہ عام طور پر پائی جانے والی اس غلط فہمی کو سختی کے ساتھ مسترد کرتی ہے کہ ایمان اور عمل صالح سے قطع نظر ایک فرد کو محض کسی مخصوص فرقہ سے تعلق یا کسی معروف اور رائج مذہب سے نسبت ہی اس کی نجات کا موجب ہوگی۔ سورہ بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ کسی فرد کا محض کسی مخصوص مذہب کا لیبل لگانے یعنی یہودی یا نصرانی یا مسلمان بن جانے سے اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بنتی۔ کیونکہ کسی فرد یا جماعت کا وہ معیار جس پر اللہ تعالیٰ اسے پرکھے گا اور جس کی بنیاد پر جزا یا سزا دے گا وہ انکے عقیدے کی سچائی، خدا کے سامنے مکمل خود سپردگی، اس کے لئے جانثاری اور تقویٰ و طہارت پر مبنی زندگی ہے۔

بسا اوقات بعض لوگ محض اپنے مذہب کی بنیاد پر جنت اپنے لئے مخصوص کر لیتے

ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ جنت میں محض وہی لوگ جائیں گے جو یہودی ہوں یا نصرانی۔قرآن مجید اس طرح کے کسی بھی دعوے کو مسترد کرتا ہے۔اس کے نزدیک یہ محض جھوٹی آرزوئیں اور کھوکھلا دعویٰ ہے۔وہ چیلنج کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اگر تمھارے پاس اسکی کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔ بالآخر اس نے حتمی اور فیصلہ کنطور پر یہ اصول یہ بیان کیا کہ جو خدا پر کامل ایمان لاکر اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کردے گا اور نیک عمل کرے گا دراصل وہی خدا کے انعام واکرام کا مستحق اور جنت کا حقدار ہوگا۔( آیات:۱۱۱۔۱۲)

کبھی کبھی لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ ہدایت تنہا انہیں کا حق ہے۔ایسا لگتا ہے کہ کسی مخصوص مذہب سے تعلق رکھنا ہی کسی فرد کے راہ یاب ہونے کی ضمانت ہے۔"یہودی یا نصرانی بنو گے تو ہدایت پاؤ گے"( آیت:۱۳۵)اسی غلط فہمی کا قلعہ قمع کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ"کہو نہیں بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا"( آیت:۱۳۵)اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں کون راہ یاب ہوگا۔

عام طور پر یہ عقیدہ بھی پایا جاتا ہے کہ کسی برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد اگر جہنم میں گیا بھی تو اس میں وہ تھوڑے دن کیلئے رہے گا اور سزا بھگتنے کے بعد پاکیزہ ہو کر باہر نکل آئے گا۔قرآن مجید یہود کے اس دعویٰ کی سختی کے ساتھ تردید کرتا ہے۔

"پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کیلئے کوئی عہد کرالیا ہے۔نہیں ایسا نہیں بلکہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے؛اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے تو وہی لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔( آیت:۸۰۔۸۲)

بسا اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سابقہ انبیاء پر بھی وہی لیبل لگا تھا جو ان پر لگا ہے۔

"کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیمؑ،اسماعیلؑ،اسحاقؑ اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟( آیت:۱۴۰)

یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ عقائد کے ثمرات کو موروثی طور پر نسل در نسل منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جب اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کو دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا تو انہوں نے اللہ تعالی سے دریافت کیا کہ کیا یہ اعزاز ان کی ذریت کو بھی حاصل رہے گا تو اللہ تعالی نے فرمایا:

''میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں جو ظالم ہوں گے۔ (آیت۔۱۲۴)

مزید زور دیتے ہوئے فرمایا۔

''یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا۔ اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔ (آیت:۱۳۴)

انتہائی اہمیت کے حامل ان اصولوں کی اہمیت کا ادراک ایک ایسی امت کے باب میں مشکل نہیں جو رہتی دنیا تک کیلئے خدائی مشن پر مامور ہے۔

## امت کے عروج وزوال کا راز

یہ بات مختلف جگہوں پر اور مختلف انداز میں واضح کر دی گئی ہے کہ عروج ہو یا زوال، ترقی ہو یا تنزلی، استحکام ہو یا انتشار اور عزت ہو یا ذلت جو کہ آج امت مسلمہ کا مقدر بن گئی ہے، مکمل طور سے اس بات پر منحصر ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کی بخشی ہوئی ہدایات کے تئیں امت کا عمل کیا ہے نیز اس بات پر کہ وہ مشن پر کس حد تک عمل پیرا ہے۔

مسلمانوں کو ہو بہو وہی تلقین کی گئی ہے جو بنی اسرائیل کو کی گئی تھی ''میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا'' (آیت:۴۰) ذلت ورسوائی اور بے بسی ومحرومی بنی اسرائیل کا مقدر بن گئی کیونکہ انہوں نے مستقل طور پر اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کا قتل کیا، ان کی نافرمانی کی اور ان کے ذریعے قائم کی گئی حدود کی مسلسل خلاف ورزی کرتے رہے (آیت:۶۱) اگر مسلمانوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو ان کا بھی یہی مقدر کیوں نہیں

بنے گا؟ اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ (آیات: ۱۵۹۔۱۶۱) میں بہت واضح طور پر بیان کردیا گیا ہے

## آسان راستہ

یہ بات نہایت زور دے کر اور مدلل طور پر کہی گئی ہے کہ اسلام کا راستہ نہایت آسان راستہ ہے۔قرآن وشریعت کا کوئی حکم انسان کی استطاعت سے باہر نہیں "اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا" (آیت: ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تمہیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا" (آیت: ۱۸۵) یہ اصول آپ کو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام میں نظر آئے گا مثلاً رمضان کی رات میں کھانے پینے اور زن وشو کے تعلقات قائم کرنے کی رخصت دی گئی ہے، سفر حج کے دوران کاروبار اور تجارت کرنے کی اجازت ہے۔ بیمار اور مسافر کو روزہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور عائلی زندگی میں باہمی رضامندی اور ہم آہنگی قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔شرعی احکام کا یہ پہلو بھی جسے اسلامی شریعت کے بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے، بالکل شروع ہی میں بیان کردیا گیا ہے، بنیادی طور پر تمام چیزیں جائز ہیں سوائے ان چیزوں کے جنہیں واضح طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

## فرد کا اختیار

گو کہ یہ سورہ کم وبیش زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ضروری احکام بیان کرتی ہے تاہم نہایت اہم بات یہ ہے کہ ان حکام کی خلاف ورزی پر سزا دینے کا کسی ایک جگہ بھی ذکر نہیں کرتی ۔البتہ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمارے سامنے بالکل مختلف طرز و انداز سامنے آتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی قرآن مجید کوئی حکم بیان کرتا ہے تو لازماً وہ دل پر دستک دیتا ہے، اس کو زندگی بخشتا ہے اور اسے اطاعت کیلئے جوابدہ بناتا ہے۔یہ چیز دل ودماغ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اس شعور سے سرشار کردیتی ہے کہ ہم مکمل طور پر اسی

کے محتاج ہیں، وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہماری ایک ایک چیز کو دیکھ وسن رہا ہے۔ ہمیں اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ ہمیں مکمل طور پر اسی کے سامنے اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہے کہ اسے کہاں اور کیسے گزاری اور اسی کے فیصلہ پر ہمارا مقدر قائم ہے۔

یوں فرد فرد کو جوابدہ بنانے اور اسے مطلوبہ فرائض کی تکمیل کا اہل بنانے کا قرآنی اسلوب بہت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی منشأ اور اس کے احکام کی بجا آوری کیلئے یہ سزا کے بجائے ضمیر کی فطری آواز پر اعتماد کرتا ہے

## سماجی زندگی

پوری سورہ ایک مضبوط اور مستحکم سماجی زندگی کو فروغ دینے پر زور دیتی اور اسے عبادت سے مربوط کرتی ہے۔ مثلاً روزہ کے تفصیلی احکام بیان کرنے کے معاً بعد یہ ہدایت دیتے ہوئے کہتی ہے۔

"اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کرسکو" (آیت ۱۸۸)

مزید برآں یہ کہ جس طرح عبادت کے لازمی احکام اور ممنوعہ اور حرام اشیائے خورد ونوش میں رعایت اور سہولت رکھی گئی ہے ایسی کوئی رعایت باہمی انسانی تعلقات میں نہیں رکھی گئی ہے۔

آخر میں ہمیں خاص طور پر یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جس مشن پر مامور کیا ہے اس کی تکمیل کیلئے محض عزم، حوصلہ، سر گرمی، ایثار وقربانی اور اس مقصد کیلئے اپنے آپ کو وقف کر کے ہی امت مسلمہ اپنے کو ترقی دے سکتی اور دنیا وآخرت میں عزت ووقار سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔